HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

معاصر اردو افسانے میں ثقافتی مغائرت کی عکاسی

A Reflection of Cultural Devastation in Contemporary Urdu Short Story

سمیعہ کوثر۔
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ ایسوی ایٹ کالج، دینہ۔
(اسکالر پی ایچ ڈی اردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد۔)

Samia Kousar.

Assistant Professor Urdu

Govt. Associate college Dina.

(Scholar Ph.D. Urdu, Muslim Youth University, Islamabad.)

عطرت بتول،
انسٹرکٹر اردو۔
لارنس روڈ آفس، لاہور،
ورچوئل یونیورسٹی، پاکستان۔

Itrat Batool.
Instructor Urdu,
LRO, VUP.
itrat.batool@vu.edu.pk

Abstract:

Cultural devastation is a key result of globalization. It has affected the practical day to day life of third world countries after destroying the norms of the society. The situation is not restricted to one's action only rather the concerned literature also started to portray cultural devastation as one of important social issue which tends towards its seriousness. Urdu short story is also affected with cultural devastation resulted from globalization. Many Urdu short story writers depicted the situation of cultural devastation in their fiction but the article is limited to the study of Mubeen Mirza, Hamid Siraj, Irfan Ahmed Urfi, Asim Butt and Farrukh Nadeem. The purpose of such depiction seems to aware the reader regarding the silent death of the society by cultural devastation. So the article is an effort to reveal the perceptions of above mentioned authors in this regard.

Key Words:

Cultural Devastation, Globalization, Urdu Short Story, Mubeen Mirza, Hamid Siraj, Irfan Ahmed Urfi, Asim Butt, Farrukh Nadeem

ملخص:

ثقافتی مغائرت عالمگیریت کی خاص دین ہے جس نے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک کی معاشرت کے پرانے رسوم و رواج کو توڑتے ہوئے ان کی روزمرہ عملی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ثقافتی مغائرت کا یہ عمل فردِ واحد کے عمل تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مذکورہ معاشروں کے ادب نے بھی اس عنصر کو ایک اہم معاشرتی مسئلے کے طور پر اجاگر کرنا شروع کر دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسئلہ گھمبیر ہے۔ عالمگیریت سے جنم لینے والی ثقافتی مغائرت اردو افسانے پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے تاہم

حرف و سخن HARF-O-SUKHAN Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

مذکورہ مقالہ مبین مرزا، حامد سراج، عرفان احمد عرفی، عاصم بٹ اور فرخ ندیم کے افسانوں کے مطالعہ تک محدود ہے۔ اس مضمون کے بیان سے مذکورہ افسانہ نگاروں کی غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مقصد قاری کو ثقافتی مغائرت کے نتیجے میں ہونے والی بتدریج معاشرتی موت سے آگاہ کرنا ہے۔ مذکورہ مقالے میں ان افسانہ نگاروں کی اس کاوش کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ:
ثقافتی مغائرت، عالمگیریت، اردو افسانہ، مبین مرزا، حامد سراج، عرفان احمد عرفی، عاصم بٹ، فرخ ندیم

لفظ "ثقافت" عربی کے لفظ "ثقف" سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی عقلمندی اور مہارت کے ہیں۔ انگریزی میں ثقافت کے لیے culture کا لفظ مستعمل ہے جو لاطینی زبان cult سے نکلا ہے اور cult کے معنی "کھیتی باڑی" کے ہیں۔ انگریزی معنی کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت ایک پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے والے رجحان کا حامل لفظ ہے جبکہ عربی الاصل کو سامنے رکھیں تو اس رجحان میں فہم اور وقوف کے عنصر کی بھی شمولیت نظر آتی ہے۔ ثقافت اپنے دامن میں روز مرہ کے تمام معمولات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے تمام حالات و واقعات ثقافت کا حصہ ہیں۔ دنیا کے تمام معاشرے اپنی اپنی ثقافت رکھتے ہیں اور یہ ثقافت ان کی شناخت اور پہچان بن جاتی ہے۔ ثقافت کے مشمولات کے ضمن میں ای۔ بی۔ ٹائلر سے منقول ہے:

> "Culture is a complex whole which includes the knowledge, beliefs, art, law, rituals and other skills and habits which individual ascribes being member of society" (1)

اس تعریف کے مطابق ثقافت ایک ایسا سالیہ ہے جو پیچیدہ خاصیت رکھتا ہے۔ اس میں علم، عقیدہ، آرٹ، اخلاق، قانون، رسم اور دوسری وہ تمام صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہیں جو معاشرے کا ایک رکن ہونے کے باعث فرد سے سرزد ہوتی ہیں۔ پھر مادہ بھی ثقافت کا لازمہ ہے۔ گویا ثقافت ایک ہمہ پہلو اصطلاح ہے جس میں فطری مظاہر یعنی ہوا، پہاڑ، درخت، پانی وغیرہ کے علاوہ دیگر تمام معمولات و شاملاتِ حیات شامل ہیں۔ اگرچہ ایک معاشرے کی ثقافت دوسرے معاشرے سے مختلف ہوتی ہے تاہم مختلف ثقافتوں میں کئی مشترکہ خواص بھی ملتے ہیں جیسے مذہب، معیشت، عائلی نظام وغیرہ ہر معاشرے کی ثقافت کے ضروری اجزا ہیں۔ یہ اجزائے ثقافت ایک ہی معاشرے کے اندر تو قریب قریب ہو سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے معاشرے میں ان عناصر کو برتنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے اور یہی اختلاف ثقافتی تغیر کہلاتا ہے۔ ثقافتی تغیر کو ثقافتی مغائرت بھی کہا جاتا ہے۔ "روسک" اور "وارن" کے مطابق:

"ثقافت کے کسی بھی پہلو میں تبدیلی کو ثقافتی تغیر کہا جاتا ہے" (2)

اس تعریف کی رو سے ثقافتی مغائرت کی یلغار زندگی کے کسی ایک پہلو پر نہ ہی کسی ایک فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ یہ ثقافت کے ہر ہر پہلو کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور اس طرح یہ پورے معاشرے کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ثقافت کے کسی بھی پہلو میں کسی بھی وجہ سے واقع ہونے والی تبدیلی ثقافتی تغیر ہے۔ اسے ثقافتی مغائرت بھی کہتے ہیں۔ ثقافت متحرک ہے اور تحریک اس کا خاصہ ہے۔ جمود ثقافت کی نفی ہے۔ ثقافت کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے حرکت لازم ہے اور اس حرکت کے دوران اس کی شکل میں تبدیلی واقع ہونا ایک فطری عمل ہے۔ ثقافتی تغیر کے پیچھے بہت سے عوامل کارفرما ہیں جن میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ جیسے جیسے ترقی پذیر انسانی معاشرے میں بدلتی اقدار کے ساتھ معیاراتِ زندگی بدلتے ہیں ویسے ویسے معاشرے کا جمالیاتی شعور بھی بڑھنے لگ جاتا ہے اور اس ذوق کی تشفی کے لیے بھی بہت سی دیگر ثقافتوں کو اپنے اندر ضم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جب ایک معاشرے کے اپنے مروجہ تہذیبی و ثقافتی ڈھانچے میں نئے معاشرتی مقصودات کی تکمیل نہیں ہوتی تو ثقافتی تغیر کا عمل از خود وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ثقافتی مغائرت کے تحت معاشروں میں تبدل واقع ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی کا عمل ہمیشہ جاری رہنے والا ہے۔ ثقافتی تفریق کا خاتمہ اور ثقافتی یگانگت کا رجحان عالمگیری عمل ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو ادب ثقافت کا عکاس ہوتا ہے۔ تحریر کا تعلق جس علاقے سے ہوتا ہے اس علاقے کی ثقافت کی جھلک تحریر میں نظر آتی ہے۔ شاعری ہو یا نثر، ہر دو اصناف ثقافت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ شاعری میں ثقافت کا انعکاس ملفوف ہوتا ہے جبکہ نثر میں یہ انعکاس کسی قدر واضح اور عیاں ہوتا ہے۔ نثری اصناف میں افسانہ ایسی صنف ہے جس میں مختصر انداز میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو خلاقانہ طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ثقافتی مغائرت عالمگیریت کا شاخسانہ ہے جس نے تمام

اصنافِ ادب بشمول افسانہ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ عالمگیریت نے برصغیر میں جہاں سماجی اور ثقافتی حوالے سے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں وہاں عالمگیریت نے زبان وادب کے سانچوں کی ثقافتی سطح کو بھی متاثر کیا ہے۔ذیل میں نئے (منتخب) اردو افسانے میں ثقافتی مغائرت کا جائزہ پیش ہے:

مبین مرزا موجودہ دور میں اردو ادب کے مستند، منفرد اور نامور افسانہ نگار، شاعر، نقاد اور دانشور ہیں۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''خوف کے آسمان تلے'' اور ''زمینیں اور زمانے'' شاعری کا مجموعہ ''رائیگانی'' شائع ہو چکا ہے۔ مبین کے افسانے سماجی و نفسیاتی کشاکش کے مرقعے ہیں۔انہوں نے بدلتے ہوئے عصری منظر نامے کو خوبی سے افسانوں میں منتقل کیا ہے اور قاری کے لیے سوچ کا در وا کیا ہے کہ آیا یہ تمدنی و ثقافتی تبدل مثبت ہے یا منفی؟ان کے افسانوں میں روایت اور جدت کی خوب آمیزش ملتی ہے تاہم تحریر کا مقصود قاری کو جیتی جاگتی زندگی سے نظریں ملانے کے قابل بنانا ہے تاکہ وہ سماجی، اخلاقی و سیاسی صورت حال میں واقع تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ مبین مرزا کے موضوعات صرف روایت کے ہی نہیں بلکہ جدید آدمی کے مسائل کے بھی عکاس ہیں۔ مثال کے طور پر وجود اور ذات کا اظہار ہمیشہ سے انسان کا سب سے اہم مسئلہ رہا ہے اور اس مسئلے کا تعلق قدامت یا جدت سے نہیں بلکہ انسان ہمیشہ سے اپنی ذات کا اظہار چاہتا ہے۔انسان نے ہر حال میں اپنا آپ دکھانا ہوتا ہے اور جب تک اس کے اندر چھپی صلاحیتیں، خوبیاں حتیٰ کہ خامیاں بھی ظاہر نہ ہو جائیں تب تک وہ نفسیاتی الجھنوں میں گھرا رہتا ہے۔وقت کی تیز رفتاری نے انسان کے پیرایۂ اظہار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے مبین مرزا کے افسانے "گم شدہ لوگ" کی مرکزی کردار انجلی کا وجودی اظہار ملاحظہ ہو:

> "اس نے سر سے پاؤں تک اپنے سراپے کو بغور دیکھا، پہلے سامنے سے اور پھر گھوم کر اس عکسی بدن کو ٹٹولا۔ نائٹی کے جھول کو ایک طرف نکال کر اسے جسم پر چُست کیا تو عکس کے نسوانی خطوط نمایاں ہو گئے۔۔۔لمبی نیند، پھلوں کے استعمال اور یوگا کی مشقوں نے ابھی اس کی عمر کو روکا ہوا تھا۔" (3)

گویا عورت اب مستور نہیں بلکہ مظہر ہے۔ ہماری ثقافت میں عورت کا یہ طرزِ ظہور مغرب کی دین ہے۔ کہاں تو عورت پر چادر لازم تھی اور کہاں وہ نائٹی میں ملبوس بدن کے زاویوں سے عمر کے بھاگتے گھوڑے کی رفتار ماپ رہی ہے۔ یہ کہانی انجلی کی ہی نہیں بلکہ دورِ جدید کی اکثر عورتوں کی یہی روش ہے۔ آج کی عورت خود کو مستور رکھنے کی بجائے اپنے جسم کی نمائش کی متمنی ہے۔وہ حجاب اور چادر کو رجعت پسندی قرار دیتی ہے۔ کسی بھی بڑے شہر میں کسی بھی پبلک پلیس پر جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس خواتین سرِ عام نظر آتی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بھی خواتین نے فرض لباس کی پامالی شروع کر رکھی ہے۔ٹی وی کی ہی مثال لی جاسکتی ہے جہاں کسی ٹی وی ڈرامے یا کسی نیوز کے سیٹ پر کسی عورت کے سر پر دوپٹہ نظر نہیں آتا کیونکہ آج عورت سر پر دوپٹہ لینے کو قدامت پسندی تصور کرتی ہے۔لباس اور جسم کی بابت جدید عورت کا یہ رجحان مغربی ثقافتی یلغار کی عکاسی کرتا ہے۔ جسم اور لباس کے علاوہ طریق ہائے زندگی میں بھی نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔اس ذیل میں محولہ بالا انجلی کا طرزِ حیات ملاحظہ ہو:

> "وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے آئی، بروکیڈ کے دبیز پردے کی ڈوری کھینچی، پردہ سرعت سے ایک طرف کھنچتا چلا گیا۔۔دیواری گھڑیال نے منادی بجادی۔"(4)

صاف ظاہر ہے کہ بروکیڈ کے دبیز پردوں سے پردہ داری تو مقصود نہیں، خاموشی اور سکون کی طلب کو البتہ ان پردوں سے مشروط کیا جاسکتا ہے۔ مشرقی معاشرت کی مخصوص چہل پہل اور بارونق آوازیں ان پردوں کی دبیز تہہ میں کہیں کھو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ پردے انسانی افعالِ قبیحہ کے مناظر بھی اپنے اندر مکمل طور پر اس طرح جذب کر لیتے ہیں کہ گناہ و ثواب کا ان کے علاوہ کوئی شاہد معلوم نہیں ہوتا۔اس جدید طرزِ حیات کے پیچھے کھڑی عورت کی وقعت بھی ان بے جان پردوں سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ جس طرح ایک پیسے والا آدمی ان بے جان پردوں کی خرید کرتا ہے اسی طرح مذکورہ عورت کی خریداری بھی کسی بے جان شے کی مانند ہی کی جاتی ہے۔ اس قسم کے جنسی تعلقات کے باب میں ہمارے معاشرے کے مقامی رجحان کا مظاہرہ انجلی کے خریدار رئیس کے ان خیالات سے لگایا جاسکتا ہے:

> "دیکھو انجلی! تم میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں ہو۔ میں تم سے پہلے بھی کچھ عورتوں سے مل چکا ہوں۔ کسی سے ایک بار، کسی سے دو بار، کسی سے چار بار۔۔۔"(5)

یعنی عورت کیا ہے؟ایک ایسی چیز جسے خریدنے کی اگر قوت ہو تو ماڈل بدل بدل کر خرید لیں۔ عورت کے بارے میں یہ تصور کم از کم ہمارے مذہب اور ہماری ثقافت کا خاصہ نہیں بلکہ یہ بھی ثقافتی یلغار کا نتیجہ ہے افسانے میں یہ طرزِ بیان اور بے باکی بھی ثقافتی و سماجی تبدل کا ہی نتیجہ ہے۔ پھر عورت، مرد اور جنسی معاملات سے آگے بڑھتے بڑھتے جدید افسانے کے موضوعات میں اس قدر تنوع آیا کہ مذہبی و سیاسی تنظیمیں بھی افسانوں میں جگہ پانے لگی ہیں۔ تنظیمی تناظر میں مذہب اور جدید میڈیا کا اختلاط مبین مرزا کے افسانے "سفید پردہ" میں دیکھا جاسکتا ہے:

"خالد ان کے ساتھ تنظیم میں تو نہیں تھا لیکن بالم بھائی کبھی کبھی اسی طرح کسی چھوٹی موٹی میٹنگ میں اسے بلوا لیتے تھے۔ کبھی شام میں کبھی رات میں۔ رات میں یہ بھی ہوتا کہ لڑکے رات کو میٹنگ کے بعد وی سی آر پر کوئی فلم یا ڈرامہ لگا لیتے۔ گپ شپ چلتی۔ ڈیک پر گانے لگ جاتے۔ پھر صبح کی نماز کے بعد وہ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔۔۔اماں اس کے یوں جانے سے خفا ہوتیں لیکن رات کو جب وہ نیند کی گولی کھا کر سوتیں تو پھر صبح ہی اٹھتیں۔ تب اسے آرام سے موقع مل جاتا۔"(6)

اس حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت کی کروٹ نے نوجوانوں کے مقاصد غیر واضح کر ڈالے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی باقاعدہ لائحہ عمل موجود نہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کا علم ہے کہ ان کے اندر مخفی طاقتوں کو کس مقصد کے لیے استعمال میں لایا جارہا ہے۔ وجودی طاقتوں کا ضیاع اور مقصدِ زیست کا عدم وجود ہمارے اسلاف، معاشرے اور مذہب کا شیوہ نہیں اور نہ ہی اسے ہمارے ہاں مستحسن سمجھا جاتا ہے لیکن جب مشرق و مغرب کی ثقافتوں کا آپس میں ادغام ہوا تو مغرب کے بہت سے چلن مشرق میں بھی عام ہو گئے جن میں ایک یہ بھی ہے کہ نوجوان اپنا وقت بے مقصد گزارنے کو عار نہیں سمجھتے۔ گھریلو عورتوں کے معمولات میں بھی واضح تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جدید وقت نے عام گھریلو عورتوں کو نشہ آور ادویہ کا عادی بنا ڈالا ہے۔ اس سے بہتر تو وقت کی پہلی کروٹ ہی تھی کہ جب معاشرے میں خالص پن موجود تھا اور نیند بھی قدرتی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ نیند سے لے کر کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا تک سب بدل گیا۔ مبین مرزا کے افسانے "خوف کے آسمان تلے" سے جدید طعام اور تخاطب کی مثال ملاحظہ ہو:

"انہیں وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب کھانے کے بعد وہ صبح کے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور انڈے وغیرہ لینے نکلے تھے۔ دروازے پر ہی تھے کہ منجھلی بیٹی دوڑتی ہوئی آئی، "پاپا، پاپا! ما کہتی ہیں بھیا کو بھی باہر ٹہلا لائیں۔۔"(7)

درج بالا حوالے کی رو سے کھانے پینے پر بھی ثقافتی مغائرت کے اثرات نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ خالص اور سادہ خوراک کا تو تصور ہی "ہائی سوسائٹی" میں ناممکن ہے۔ کہاں تو باورچی خانوں میں پکتے پراٹھے صبح کی ابتدا اور بھرپور آغاز کی علامت ہوتے تھے اور کہاں ڈبل روٹی نے ناشتے کے مرکزی کھانے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اسی طرح چھوٹے بچے بالعموم ماؤں کے ساتھ رہتے اور رات کے اوقات میں تو بالخصوص ماں کے گرد بچوں کا گھیرا تنگ ہو جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ چھوٹے بچے گھر کی چار دیواری سے نکل کر باہر جاتے ہوئے باپ کے ہمراہ نظر آنے لگے۔ پھر ماں "مما" اور باپ "پاپا" ہو گئے تو اس اندازِ تخاطب سے بھی عام معاشرے پر ثقافتی یلغار کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اثرات عام گھر، گلی محلے سے نکل کر مکتب اور مدرسوں پر بھی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا افسانے میں دورِ حاضر کے طلبہ کے بارے میں ان کے ایک استاد کا خیال کچھ یوں ہے:

"ان کا خیال تھا کہ وہ زمانے گزر گئے جب نوجوان نسل اساتذہ کے آگے مؤدب رہتی اور آنکھیں بچھاتی تھی۔ اب تو لڑکے بدتہذیبی اور بدلحاظی کے عادی ہو گئے تھے اور اس کو آزادی کا نام دیا جاتا تھا۔"(8)

استاد اور شاگرد کے حوالے سے دیکھا جائے تو دنیا کے تقریباً ہر معاشرے میں استاد کی تعظیم و تکریم کی روایت ملتی ہے اور ہمارے معاشرے میں تو خصوصی طور پر اساتذہ کی قدر و منزلت کو پہچاننے اور ان کی خدمت اور ادب کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اب ہمارے معاشرے میں وقت کے ساتھ ساتھ استاد کے ادب و احترام کو بھولا جا رہا ہے اور شاید اسی لیے آج ہم اخلاقی و سماجی مسائل سے دوچار ہوتے جا رہے ہیں۔ ماضی میں اساتذہ کی قدر و منزلت یہ تھی کہ جب تک استاد بیٹھ نہیں جاتے تھے طلبہ ان سے پہلے بیٹھنے کی جرأت و جسارت نہیں کرتے تھے مگر آج ایسا نہیں ہے۔ آج کے جدید دور میں ہم اپنی ثقافت اور اقدار کو بھولتے جا رہے ہیں اور اپنی ثقافت سے یہ پہلو تہی دراصل مقامی ثقافت میں اغیار کی ثقافتوں کے ادغام کا ہی نتیجہ ہے۔ حالانکہ استاد کا مقام و مرتبہ بہت اعلیٰ وافضل ہے اور ان کی عزت کرنا یا ان کی تعظیم و توقیر کرنا محض طلبہ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد پر ان کا احترام واجب ہے۔ ہمارے اکابرین اور بزرگوں کے متعدد ایسے واقعات و حالات ملتے ہیں جن میں وہ اپنے اساتذہ کے ادب کا احترام کا غایت درجہ اہتمام کرتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں طلبہ اپنے اساتذہ سے کئی کئی سال تعلیم حاصل کر کے بھی ان کو وہ قدر و قیمت نہیں دیتے جو ان کا حق ہے۔ لیکن ثقافتی مغائرت کے زیرِ سایہ ریت روایات بدل گئی ہیں اور کل کو جو افسانہ استاد کے ادب و احترام کی تعلیم دیتا تھا آج اسی افسانے میں کھلے بندوں استاد کی تکریم و تعظیم کی شرح میں کمی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ثقافتی مغائرت نے عصرِ حاضر کے انسان کو ایک ایسی آٹومیٹک زندگی عطا کی ہے جس میں فرد کے معمولات بدل چکے ہیں اور اس کی زندگی میں عملی تحریک کم ہو گئی ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "دامِ وحشت" سے غیر فعال اور مجہول طرزِ زندگی کی ایک مثال پیش ہے:

"۔۔یہ وزن کیسے کم ہو۔ یہی تو مشکل ہے۔ سارا دن دکان پر بیٹھے رہنا، رات کو کھانا کھا کر ٹی وی دیکھنا اور سو جانا اور دن میں سفر سارا کا سارا گاڑی میں۔ نام کو بھی چلت پھرت نہیں، ذرا سی جسمانی مشقت نہیں تو پھر وزن بڑھے گا نہیں تو کیا کم ہو گا۔"(9)

مذکورہ افسانے کے ہیرو کا باپ پچھلی پیڑھی سے تعلق رکھتا تھا سو وہ دکانداری کے دوران بھی متحرک رہتا تھا لیکن جب یہی فعل بیٹا سر انجام دیتا ہے تو انداز ہی بدل جاتا ہے۔ مبین مرزا کا افسانہ "دام وحشت" صارفی معاشرے کا بہترین اظہار ہے جس کا مرکزی کردار مالی اعتبار سے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے تو اس کی سوچ کا زاویہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے مسجد کے امام کی آواز نسائی آواز سے خواہ مخواہ مشابہ معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ جمعہ کی نماز میں اس کا صرف جسم حاضر ہوتا ہے جبکہ اس کے خیال میں نسائی پیکر متحرک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس فعل میں خود کو اس لیے حق بجانب سمجھتا ہے کیونکہ اس کی بیوی لگ بھگ ڈیڑھ سال سے امریکہ میں اپنے بھائیوں کے پاس مقیم ہے۔ وہ اپنی آخری اولاد پیدا کرنے امریکہ جاتی ہے تا کہ گرین کارڈ کا حصول ممکن ہو سکے اور اس کو امریکہ بھیجنے والا بھی اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ یہاں شوہر صاحب ایک جانب اس لیے درست ہیں کہ نائن الیون کے واقعہ کے بعد گرین کارڈ تحفظ کی علامت بن جاتا ہے تو دوسری جانب وہ عورتوں کو خیال میں جگہ دینے پر بھی حق بجانب ہیں کیونکہ اپنی عورت میسر نہیں ہے۔ اس سارے منظر میں یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ہماری ترجیحات اور ہمارا اندازِ حیات ایک دائرے سے نکل کر اونچی اڑان بھرنے لگا ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "بے خواب پلکوں پہ ٹھہری رات" میں شخصیت سازی کی ذیل میں ایک پاکستانی اور ایک برطانوی شہری کی سوچ میں تفریق ملاحظہ ہو:

"تم لوگ خوفناک حد تک خواب پرست ہو۔۔ اتنے جنونی خواب پرست کہ تم اپنی اولاد کو اس کا مستقبل دینے کی بجائے اپنا ماضی ورثے میں دے دیتے ہو۔" پچھلے دنوں برطانوی اسکالرز کے وفد کے ساتھ آئی ہوئی پروفیسر ایمیلی جیمز نے برٹش کونسل کی لائبریری میں مجھ سے کہا تھا۔

"انسان فطرتاً ماضی پرست ہے مادام" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سنو! لیکن ہم لوگ اپنی اولاد کو ماضی کے نام پر اپنی ناکامیاں، اپنی حسرتیں، اپنی نفرتیں اور اپنے دکھ نہیں دیتے۔ ہم انہیں ٹیکنالوجی، سائنس، معیشت، نئی امنگیں اور تجسس ورثے میں دیتے ہیں۔ پروفیسر سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا تم لوگ۔۔۔"

"مادام! مادام!" میں نے بات اچکتے ہوئے کہا، "جس کے پاس جو کچھ دینے کے لیے ہوتا ہے وہ اپنی اولاد کو ورثے میں وہی کچھ دیتا ہے۔" بولتے بولتے اچانک مجھے لگا جیسے میری زبان پر انگارہ رکھا ہوا ہے۔

“Yes! Self deception eventually comes to a lam excuse.”

پروفیسر ایمیلی جیمز نے قہقہہ لگایا۔

میرے اندر دکھ کا احساس سانپ کی طرح بل کھاتا چلا گیا اور پھر میرے سامنے چوبیس برس پرانا ماضی آن کھڑا ہوا۔"

(10)

مذکورہ بالا افسانے میں مذکور شخص اپنے خطے کی کم مائیگی پر پر ملال ہے۔ مذکورہ بالا حوالے میں بھی جس احساس کمتری، بنیاد پرستی اور جنونی پن کی بات کی گئی ہے وہ کمزور ملکی نظام کی دین ہے۔ یہاں قابل افسوس بات یہ ہے کہ ثقافت کی بالائی سطح پر تغیر آنے کے باوجود معاشرے کی اندرونی فعل و عمل کی صورت حال فرسودہ ہی ہے۔ جدید افسانے میں ثقافتی تغیر کے ان دو مختلف درجات کی نشاندہی افسانے میں عالمگیری نقوش کو اجاگر کرتی ہے۔ ثقافتی تغیر کی ایک سطحی مثال افسانہ "خواب ہار آدمی" سے لی جا سکتی ہے جو سراج نامی ایک دماغی طور پر مفلوج آدمی کی کہانی ہے جس کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے۔ سراج کی بیوی سائرہ کے ذمہ اس کی دیکھ بھال ہے جس کی وجہ سے سائرہ کے سماجی معمولات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس خلل کی ایک جھلکی پیش ہے:

"سائرہ بیگم! تم آج کل کس جہان میں ہو؟ نہ کلب آتی ہو اور نہ ہی کسی پارٹی میں دکھائی دیتی ہو۔ کہاں ہو؟"

"نرگ میں"

نو۔۔ نو۔۔ مڈل کلاس فلمی ڈائیلاگ!"

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

"یہ کوئی ڈائیلاگ نہیں ہے۔"

"سائرہ بیگم! فار ہیونز سیک، کیا ایک مہینے بعد تم نے شکل اس لیے دکھائی ہے کہ تم مجھے بور کرو گی؟ ویسے آپس کی بات ہے، میں بالکل نہیں سمجھ پارہا تم آج اتنی خوبصورت کیوں لگ رہی ہو۔۔۔ کیا کوئی بیوٹی ٹپس چل رہے ہیں۔"

(11)

درج بالا اقتباس میں مذکورہ عورت کا شوہر ہسپتال میں داخل ہے اور وہ بیمار کا حال پوچھنے ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے لیکن ڈاکٹر کی حالت دیکھیے کہ جس کے لیے مریض سے بڑھ کر اس عورت کا حسن اور اس کی فعالیت مقدم ہے۔۔ گویا مسیحا بھی اپنے پیشے سے زیادہ دیگر معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر خاتون کے انداز سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ڈاکٹر کے ساتھ ایسی گفتگو معمول ہے۔اس قسم کے معمولات ہمارے مقامی معاشرے کے مظہر نہیں بلکہ خواتین کے یہ اندازہائے دلبرانہ، اغیار کے ساتھ بے تکلفی اور یہ مخلوط زبان وبیان اغیار کی ثقافت کے ادغام کی نشانی ہے۔ معاشرتی معمولات کا یہ فرق روز مرہ گفتگو اور لین دین سے لے کر مذہب تک کے معاملات تک پھیلا ہوا ہے۔ ثقافتی یلغار نے مذہبی معمولات کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔اس ضمن میں افسانہ "سفید پھولوں کے اس طرف" کے ایک اقتباس میں موجودہ عہد میں مذہب کے وجود کے حوالے سے مرکزی کردار عاطف کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"عاطف! تم نے تو کہا تھا کہ مذہب کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی بنا پر انسان کے سماجی رشتے اور تعلقات متاثر ہوں۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود دو افراد ایک مشترک زندگی گزار سکتے ہیں۔"

(12)

مذہب کو یوں رشتوں سے نکال باہر کرنا ایک لادین معاشرے کی جانب بڑھتے اقدام کی نشانی ہے اور یہی عالمگیریت کا مقصود بھی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر نہ صرف اسلام بلکہ دیگر ادیان کو بھی عدم فعال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور مذہب کو کسی بھی معاشرے کا ثانوی ادارہ قرار دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک لادین معاشرہ تخلیق پاتا ہے۔ اردو افسانے بھی قاری کو مقامی ثقافت و معاشرت کے نقائص دکھانے میں اور اغیار کی ترقی یافتہ تہذیب کا تاثر دکھانے میں پیش پیش ہیں۔اس ضمن میں مبین مرزا کے افسانے "بھولی بسری عورت" کی مثال لی جاسکتی ہے جس میں ایک عام آدمی کے ہاں مستقبل سازی اور اعلیٰ تعلیم کے رجحان کی جھلک نظر آتی ہے۔ساتھ ہی یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں میسر تعلیمی مواقع اعلیٰ نہیں بلکہ تعلیم کا اعلیٰ ہونا ترقی یافتہ ممالک سے نسبت رکھتا ہے۔مذکورہ بالا افسانے سے اعلیٰ تعلیم کی مثال ملاحظہ ہو:

"طارق انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلا گیا۔ تعلیم کے مکمل ہوتے ہی اسے وہیں ملازمت مل گئی۔ طارق کے والد سرکاری ملازم تھے۔۔۔امریکا میں ملازمت کے بعد طارق چار پانچ سال کے وقفے سے پاکستان کا چکر لگاتا رہتا تھا۔۔"(13)

یعنی وہ زمانے گئے کہ جب کمائی کم ہوتی تھی لیکن رشتے پاس ہوتے تھے۔اب تو زندگی کا مقصد کسی ترقی یافتہ ملک سے ڈگری حاصل کرنا اور پھر وہیں ملازمت کر کے پیسے کمانا ہے۔ بیرون ملک تعلیم کی غرض سے جانے والے اکثر افراد یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ واپس آکر اپنے پسماندہ ملک کی ترقی کا ذریعہ بنیں۔ ثقافتی مغائرت نے ایک عام آدمی کی سوچ کا زاویہ اس قدر بدل ڈالا ہے کہ اسے سنہری مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے خالص رشتوں اور اپنے وطن کی محبت سے دور ہو جانا گوارا ہے۔ کاروبار زندگی، معاشرتی معمولات اور مذہبی بحثوں سے لے کر ازدواجی و جنسی معاملات تک پر ثقافتی تغیر نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور ہماری ثقافتی، مذہبی و معاشرتی اقدار کو خوب پامال کیا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ "اجنبی موسم" میں شادی جیسے بنیادی معاشرتی وظیفے کی نفی ملاحظہ ہو:

"منو! تم نے اب تک شادی وادی کیوں نہیں کی؟"

"ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی؟" منو نے کاندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے؟"

" میں نے اس بارے میں seriously کچھ سوچا ہی نہیں۔ ویسے وہ جو مقولہ ہے. If milk is available."(14)

درج بالا مکالمہ مغربی سوچ اور مغربی جنسی معمولات کا کھلا اظہار ہے اور مقامی معاشرے کے افراد کے ہاں ایسی سوچ کا جگہ پانا عالمگیریت کی گہری ضرب کا شاخسانہ ہے۔ مغرب میں مرد و عورت کے مابین جنسی تعلق کو بغیر شادی کے غلط نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہاں بغیر شادی کے تعلقات کو اچھا سمجھا جاتا ہے اور اس کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس طرح جنسی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد مرد و زن ایک دوسرے سے آزاد ہو سکتے ہیں اور خواہ مخواہ کی ذمہ داری نہیں نباہنی پڑتی۔ لیکن ہمارے معاشرے و مذہب میں اس بات کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں شادی ایک پاکیزہ رشتہ ہے جس کے تحت دو افراد کے مابین ایک مضبوط تعلق پروان چڑھتا ہے اور اس میں عزت، محبت اور ذمہ داری کا احساس شامل ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر شادی سے بے رغبتی کا اظہار عام ہو جائے تو ایک پابند معاشرے پر ایک آزاد معاشرے کے اثرات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جنسی معاملات ہی نہیں بلکہ دیگر کئی معاشرتی معمولات ہیں جو ثقافتی انضمام کی بدولت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شراب نوشی بھی ان میں سے ایک ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں معمولاتِ عامہ میں مے نوشی کی مثال پیش ہے:

"منور صوفے اٹھ کر سرہانے کی طرف گیا اور سائیڈ ٹیبل پر نچلے خانے سے چپٹی سی بوتل نکال لایا۔
"فرخندہ! برا نہیں ماننا یار۔ مجھے رات کے کھانے سے پہلے تھوڑی سی پینے کی عادت ہے۔"(15)

ہمارے معاشرے میں شراب نوشی کا توارد بھی مغرب کا تحفہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ شراب پینے والے افراد کو معاشرے میں تنفر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن وقت نے جدت کی کروٹ لی تو شراب کو معیوب سمجھنے کی بجائے اسے معمول بنانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی گئی۔ عالمگیریت اور ثقافتی یلغار نے مغرب کا مشروب مشرق میں بھی عام کر دیا اور اردو افسانہ جو کبھی اس مشروب کی مذمت میں لکھا جاتا تھا، اب اس میں یہ موضوع انتہائی ہلکا اور معمولی ہے۔ اس ہلکے پن سے ہی معاشرتی تغیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مبین مرزا نے اپنے افسانوں میں سادگی کے ساتھ معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار پر چوٹ کی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے تغیر و تبدل کو موضوع بنایا ہے اور روایت سے جدت تک کے سفر کو اپنے کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ حقیقت میں وہ اپنی ثقافت سے جڑے ہوئے افسانہ نگار ہیں اس لیے افسانہ تحریر کرتے ہوئے جب ان کے مشاہدے میں ثقافتی اقدار کا کھوکھلا پن سامنے آتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔

عالمگیریت کے تحت لکھے جانے والے اردو افسانے میں حامد سراج کے افسانے کا نمایاں مقام ہے۔ محمد حامد سراج کے پانچ افسانوی مجموعے "وقت کی فصیل"، "برائے فروخت"، "چوب دار"، "بخیہ گری" اور "برادہ" شائع ہو چکے ہیں۔ حامد سراج نے سیاسی و معاشرتی صورتحال کا بخوبی جائزہ لیتے ہوئے اور اپنے فن پاروں میں برتتے ہوئے معاشرے کی اہم خرابیوں پر چوٹ کی۔ ان کے موضوعات میں ایسے موضوعات شامل ہیں جن پر لکھنے کی جسارت ہر افسانہ نگار نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر بیوروکریسی کو ہی لے لیں۔ حامد سراج کے افسانے "ہونٹ کنارے" سے بیوروکریسی کا مفصل بیان نقل ہے:

"سلیم الرحمٰن پاکستانی بیوروکریسی کا ایسا پرزہ بن گیا جو روبوٹ کی طرح اپنے آقا کا ہر حکم بجا لاتا۔ شہر کی بلند قامت عمارات میں سے ایک عمارت کی گیارہویں منزل پر اس کا دفتر تھا۔ گاڑی مین گیٹ سے اندر داخل ہوتی، سیلیوٹ، وہ نپے تلے قدموں سے لفٹ تک پہنچتا، خودکار لفٹ اسے گیارہویں منزل تک پہنچا دیتی۔ دیو قامت میز جس کے ایک سرے پر گھومنے والی کرسی میں دھنسنے سے پہلے وہ عقبی کھڑکی کا پردہ سرکا دیتا۔ میز کا حدود اربعہ بھی بیوروکریسی کے افسرانِ بالا طے کرتے تاکہ عوام میں سے اگر کسی کو شرفِ ملاقات بخش بھی دیا جائے تو اسے ہاتھ ملانے کی تکلیف نہ ہو اور آقا کے سامنے رکھی کرسی پر وقت کی تکلیف کاٹ کر چلتا بنے۔"(16)

جس ملک میں ستر فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے لڑھک چکی ہو، جہاں علاج اور تعلیم سے محروم انسانوں کے ریوڑ کھلے آسمان کے نیچے آہ و بکا کر رہے ہوں، وہاں بااختیار افسران دفاتر میں اور کے بیوی بچے بھی وسیع و عریض بنگلوں میں پُر تعیش زندگی گزارتے ہوں، مہنگی ترین لگژری گاڑیوں میں نویلی شاہراہوں اور موٹرویز پر فراٹے بھرتے ہوں اور موسمِ گرما کی تعطیلات گزارنے بیرونِ ملک جاتے ہوں، شاپنگ بھی لندن، امریکہ اور دبئی سے کم کسی ملک سے نہ کرتے ہوں، وہاں عام فرد کی قدر و منزلت کا تعین درج بالا اقتباس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ حامد سراج کے ہاں وقت کی تیز رفتار گاڑی کے مسافر جدت آمیز ماحول میں یوں ڈھلے نظر آتے ہیں کہ جیسے یہی ماحول اس کا مقصود ہو:

"اسے گھڑی کی سوئی کے ساتھ ایسے طور پیوست کر دیا گیا کہ وہ ٹک ٹک گھومتا رہا۔ خوبصورت بیوی، پارٹیاں، رقص و سرود، بیرونی ممالک کے دورے، بینک بیلنس، اسے ہر آسائش میسر تھی۔"(17)

نفسا نفسی عروج پر ہے۔ رنگا رنگی ماحول کا لازمہ ہے۔ وقت کا مقصد صرف اور صرف مادی تعیش کا حصول ہے۔ ایسے میں انسان گھڑی کی سوئیوں کی مانند تحریک میں رہتا ہے تب ہی جا کر اس کے لیے اپنی لایعنی خواہشوں کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج کا دور مکمل طور پر مادیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان کا مادی اشیاء سے لگاؤ اور ظاہری عیش و عشرت کا دلدادہ ہونا عام ہو چکا ہے۔ جب انسان کو مادی اشیاء سے محبت ہونے لگتی ہے اور دنیاوی لذتیں اس کو اچھی لگنے لگتی ہیں تو مادیت پرستی اس کی نفسیات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مادہ سے محبت انسان کی اپنی تخلیق کردہ نہیں ہوتی۔ دراصل انسان جس ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے یہ سب اس کا نتیجہ ہے۔ جس طرح کا ماحول اور معاشرہ ہوتا ہے اسی قسم کے اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں اور اس ضمن میں یہ حقیقت قابلِ افسوس ہے کہ ہمارا معاشرہ ثقافتی مغائرت کے زیرِ اثر مغربی طرزِ زندگی سے متاثر ہے۔ اسی اثر کے تحت ہمارے ہاں مال جمع کرنا، بینک بیلنس بنانا، وسیع رقبے پر محیط گھر، لگژری گاڑیوں کی دھن ہر آدمی پر ہر وقت سوار رہتی ہے۔ مادیت پرستی اپنی جڑیں اس قدر مضبوط کر چکی ہے کہ ہماری سوچ صرف ظاہری شان و شوکت اور شکل و صورت تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ حامد سراج نے اپنے افسانوں میں مادیت پرستی کو خصوصی موضوع بنایا ہے۔ اس ذیل میں ان کے افسانے "اکتوبر کے آخری دن" سے جدید طرزِ سفر کی مثال دیکھیں:

> "ارینا نے اپنا موبائل نکال کر کار کے Deck کے ساتھ منسلک کیا اور پوری آواز میں موسیقی کے سر بکھر گئے۔۔۔ ساتھ ہی اس نے چاروں بلیک جالی دار پردے کار کے شیشوں پر کھینچ دیے۔"(18)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فی زمانہ گاڑی ضرورت ہے ۔ لیکن ضرورت سے بڑھ کر اب تو خالص جذبے اور محبتیں بھی گاڑی کی محتاج نظر آتی ہیں۔ یہ معاشرے میں حد سے بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کی نشانی ہے۔ دورِ جدید میں محبت کی پرداخت کا حال دیکھیں:

> "آپ کے نرم ہاتھ ہمیشہ میرے ہاتھوں میں رہیں گے۔ کار میں آپ کے نرم ہونٹوں کا لمس ہمیشہ یاد رہے گا۔"
> (19)

محبت کے اس اظہار سے صاف ظاہر ہے کہ فی زمانہ محبت کے لیے گاڑی اور بنگلہ جذبات سے زیادہ اہم ہے۔ معاشرے میں اگر کسی کا اوڑھنا بچھونا اچھا ہے اور وہ مالی طور پر مضبوط ہے تو وہی لوگوں کے لیے قابلِ احترام ہے۔ پہلے پہل لوگوں کی پہچان انسان کے کردار اور سیرت سے کی جاتی تھی لیکن اب یہ پہچان ظاہری شان و شوکت سے کی جاتی ہے۔ انسان مسلسل خواہش کے تعاقب میں ہے۔ روحانی اقدار کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مادیت پرستی کی وجہ سے معاشرے میں عدم توازن کی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ حامد سراج نے اپنے افسانوں میں مادیت پرستی کی اس خطرناک صورت حال کو خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں ان کا افسانہ "سیاہ کار" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ نمونے کے طور پر "سیاہ کار" سے ایک اقتباس نقل ہے:

> "۔۔دونوں کار میں لمبی ڈرائیو پر نکلے۔ بوندا باندی ہونے لگی تو اس نے کار کے وائپر چلا دیے۔ ایک شاپنگ پلازہ سے انھوں نے خریداری کی، کولڈ ڈرنکس اور ساتھ کچھ کھانے کو لیا اور دوبارہ کار میں آ بیٹھے۔ کبھی کبھی بے مقصد وہ Long Drive کے لیے نکلا کرتے تھے۔۔"(20)

افسانہ "سیاہ کار" جدید دور کا المیہ ہے۔ افسانے کی ہیروئین ذکیہ ایک کمپنی میں ملازم ہے۔ اس کے اور اس کے شوہر کے مابین خاصا فاصلہ ہے۔ دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ موبائل پر ذکیہ کی دوستی نعیم سے ہوتی ہے جو ملاقات تک پہنچ جاتی ہے۔ پہلی ملاقات پر اسے بیش قیمت تحفہ ملتا ہے اور ذکیہ یہ تحفہ چھپانے سے قاصر ہے جس پر وہ اسے بیچ دیتی ہے۔ تحفے کے عوض اسے ایک لاکھ روپے ملتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر ذاکر سے جھوٹ بولتی ہے کہ اسے کمپنی سے بونس ملا ہے جس سے وہ گھر کے پردے اور صوفے تبدیل کرے گی۔ ذاکر کی اس میں دلچسپی فقط اتنی ہے کہ وہ دونوں ایک ہی مکان کے مکین ہیں اور بس۔۔ نعیم ذکیہ کو اپنے گھر بلاتا ہے تو پچھلے تحفے کی قیمت اسے وہاں جانے پہ اکساتی ہے۔ نعیم اس کے گھر آنے والے وقت کی قیمت ایک گاڑی کے برابر رقم کی صورت اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اسے مہینے میں ایک بار اس کے گھر آنا ہوگا۔ ذکیہ استفسار کرتی ہے کہ صرف ایک بار ہی کیوں؟ اس پر نعیم جواب دیتا ہے کہ جب اس کی بیوی امریکہ جاتی ہے تو اس کی غیر موجودگی میں اس کے قریباً سات عورتوں سے مراسم ہوتے ہیں اور اس حساب سے ذکیہ کی باری صرف ایک بار بنتی ہے۔ ذکیہ اس کے جواب پر بھونچکارہ جاتی ہے۔ شاید اسے اپنی اس قدر بے قدری کی توقع نہیں ہوتی تاہم پیسے کی کشش اسے یہ رابطہ استوار رکھنے پر اکسائے رکھتی ہے۔ دوسری جانب سرِ راہ نعیم کی بیوی کی ملاقات ذاکر سے ہوتی ہے تو وہ اس سے میل ملاقات بڑھا لیتی ہے۔ دونوں خوب وقت گزارتے ہیں اور نعیم کو اس کے وقت کی پوری پوری قیمت ملتی ہے۔۔ پورا افسانہ ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں وقت کے بکنے اور خریدے جانے کا بیان ہے۔۔ جس میں جذبات کی منڈی لگ رہی ہے۔۔ جس میں موبائل کلچر خاندان کی اکائی کو ختم کر رہا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

حامد سراج نے ثقافتی مغائرت کی اہم پیداوار یعنی جدید ٹیکنالوجی کو اپنے افسانوں میں خوبی سے ظاہر کیا ہے۔اس ذیل میں حامد سراج کے افسانے "جرابوں کی تدفین "میں زچگی کا جدید مناظرہ پیش ہے :

"۔۔نئے تعمیر شدہ میڈیکل کمپلکس میں آپی Admit ہیں۔ سرجری میں ابھی دو دن باقی ہیں۔آپی کے چہرے پر کہیں خوف کی پرچھائیں نہیں ہے۔ان کا کہنا ہے کہ آپریشن بھی ہماری زندگی کا حصہ ہو گئے ہیں۔یہ آپی کا تیسرا اور آخری cesarian ہے۔شہر کی قابل ترین گائناکالوجسٹ on call ہے۔"(21)

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ آپریشن کے ذریعے پیدائش کو عالمی ادارۂ صحت نے دنیا بھر میں اس کے نقصان دہ اثرات کے باعث ناپسندیدہ طریقہ قرار دیا گیا ہے۔یہ درست ہے کہ بعض صورتوں میں آپریشن ناگزیر ہوتا ہے لیکن تمام صورتوں میں بہر حال ایسا نہیں ہوتا۔ دیگر معاشرتی خرابیوں کے ساتھ ساتھ حامد سراج نے معاشرے میں خاندانی نظام کی نفی اور جنسی روابط کی آزادی کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔افسانہ "اکتوبر کے آخری دن" میں عائلی نظام کے انہدام کی مثال دیکھیں:

"میں آپ کی Wife ہوں۔سو فیصد آپ کی۔نکاح نہیں ہوا تو کیا ہوا؟"(22)

ہمارے ہاں عورت کا یہ کلام مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔مغرب میں ہر بالغ شخص کو کھلی چھوٹ حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے چاہے اپنی زندگی گزارے اور جنسی تعلقات پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔لیکن ہمارے مذہب میں نکاح کے علاوہ تمام صورتیں ناجائز اور حرام ہیں۔ایسی صورت میں جب ایک فرد کے ہاں مذکورہ بالا رویہ جنم لیتا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے مذہب کی ایسے افراد کی زندگی میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔حامد سراج نے اپنے افسانوں میں اس نوع کے نازک معاملات کو بہ طریقِ احسن قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔حامد سراج کے افسانے پڑھ کر قاری چشمِ تصور سے اُن تمام الم ناک واقعات اور گہرے زخموں کی ادھیڑ بن کا پسِ منظر دیکھ لیتا ہے جن مناظر کو محمد حامد سراج نے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر انہیں افسانے کا پیراہن پہنایا ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ دار ہیں۔ان کے اسلوب میں پائی جانے والی فطری بے ساختگی قاری کو جہانِ تازہ میں پہنچا دیتی ہے اور قاری تہذیب و ثقافت کی گرتی ہوئی عمارت تلے لمحۂ آئندہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

نئے افسانے کی دنیا میں ایک اہم نام عرفان احمد عرفی کا ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے "پاؤں" اور "کنٹرول روم" اپنی نوعیت کے منفرد مجموعے ہیں۔ان کی سوچ سطحی نہیں بلکہ بہت گہری ہے اور اسی سوچ کی مدد سے وہ معاشرے کے اس روزن سے بھی جھانک لیتے ہیں جہاں عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔وہ ان خفتہ سوراخوں کے پیچھے پنپتی زندگی کو اپنی کہانی کی بنیاد بناتے ہیں اور ان کے افسانوں میں کسی مخصوص طبقے کی نہیں بلکہ ہر طبقے کی تصویر نظر آتی ہے۔عرفی کے افسانوں میں جدید معاشرے کا موضوع عام ملتا ہے۔دورِ جدید میں بہت سے عوامل کے نتیجے میں متعدد سماجی و معاشرتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔قدیم سماجی ڈھانچہ، معاشرتی اقدار، خاندانی نظام اور سماجی ادارے شکست و ریخت کا شکار ہیں اور ان کی جگہ نیا سماجی ڈھانچہ، اقدار اور ادارے بن رہے ہیں۔عرفی کے افسانوں میں اس معاشرتی جدت کو کھل کر موضوع بنایا گیا ہے۔انہوں نے جدید معاشرے کی خصوصیات پر کسی قسم کا پردہ نہیں ڈالا اور جدت کی آڑ میں درپیش مسائل کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے افسانے "نوٹنکی" میں جدید معاشرت کی جھلک دیکھیں:

"غصے میں بھری عورت اینکر پرسن کو نفرت سے دیکھتی ہوئی اس کے برابر بیٹھے مہمانِ خصوصی کو اوٹ میں سے نکالنے کے لیے لپکتی ہے جو گیٹ اپ سے انیس بیس گریڈ کا سرکاری ملازم نظر آرہا ہے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا تم اسی حرافہ کے ساتھ یہاں آئے ہو گے۔اب تم یہی کہو گے کہ میرا اس کا ورکنگ ریلیشن شپ ہے۔"دیہاتی لہجے میں بھرتی بیوی سے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بیوروکریٹ سہم جاتا ہے۔۔۔

"تو یہ ہے آپ کی فرسٹ کزن جو آپ کی بیگم بھی ہے سر۔۔۔؟اینکر پرسن ڈپٹی سیکرٹری نما اپنے بوائے فرینڈ سے مخاطب ہے۔"آپ کا تو دعویٰ تھا کہ آپ کے خاندان کی ہر عورت ورلڈ کلاس سکولنگ کی پروڈکٹ ہے۔۔؟"

"سکولنگ سے بیک گراؤنڈ نہیں۔۔۔فور گراؤنڈ بدلتا ہے میڈم۔"(23)

گویا بیک گراؤنڈ اس قدر ناگوار عنصر ہے کہ جس کو بدلنا ہی مقصود ٹھہرا اور پھر یہ افسوس کہ اعلیٰ تعلیم کے باوجود فرسودہ بیک گراؤنڈ ماڈرن نہیں ہو پاتا۔ دراصل ہمارے معاشرے میں خاندان میں شادی کا رواج ہے اور مرد چاہے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اس کی شادی خاندان میں ہی کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔دیہات سے

تعلق رکھنے والے امراء، وڈیروں اور افسران کی کی خاندانی بیویاں بھی دیہاتی ہوتی ہیں جیسا کہ درج بالا حوالے سے ظاہر ہے۔ دیہاتی عورت اپنے مرد کے معاملے میں خاصی جذباتی ہوتی ہے لیکن جب ان جذبات کا مظاہرہ شہری ماحول میں کیا جاتا ہے تو اسے فرسودگی اور اجڈ پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرد اگر رشتے نباہنے میں اخلاص کا مظاہرہ کرے تو یہ نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے معاملات میں تعلیم کو تو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ دراصل عالمگیری مقصدِ تعلیم بھی یہی سامنے آتا ہے کہ زندگی سے جذبات کو خارج کر کے صرف دو جمع دو چار کے معاملات پر غور کیا جائے اور ترقی کے نام پر شخصی آزادی کی کوئی حد نہ رکھی جائے۔ عرفی نے مذکور بالا افسانے میں اسی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ترقی یافتہ زندگی کی ذیل میں عرفان عرفی کے افسانہ "بن بڈھا" میں لندن زدہ زندگی کا بیان ملاحظہ ہو:

> "بہت سال پہلے لندن کے ایک معتبر سکول کی روش پر شدید جاڑوں کی دھند میں اگر جوانی اس کے ساتھ اتنے آتشیں دھماکے کے ساتھ نہ ٹکراتی تو ممکن تھا وہ ڈگری مکمل ہی کر لیتی۔
>
> "تم سے اپنی لو لائف بیان کرتے ہوئے میں کبھی ہچکچائی نہیں حالانکہ تم اندر سے جتنی بڑی بچ ہو میرے لیے محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔" اس بات پر ہم دونوں زوردار قہقہہ لگاتے اور بعض اوقات آپس میں اپنے ہاتھ بھی ٹکراتے جن کی رگڑ سے کبھی بجلی نہ نکلتی۔۔"(24)

لندن کی تعلیم ہی ایک معیار ہے کہ جو جدید معاشرت میں کامیاب زندگی کی علامت ہے اور یہ کامیابی کرداروں کی زبان میں رچ بس گئی ہے۔ "بچ" کا لفظ روزمرہ گفتگو میں شامل ہونا لندن کے معتبر اسکول کی اسکولنگ کی خوب عکاسی کر رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظریات اور تعلیمی اقدار بدل رہی ہیں اور اس حوالے سے ترقی یافتہ ممالک کی ترقی پذیر ممالک پر برتری کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ فرسودہ طریق ہائے تعلیم کی جگہ جدید تعلیم رائج ہو رہی ہے اور عالمگیریت نے جدید تعلیم کو ہی کامیابی کی ضمانت قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے عرفان عرفی کے ہاں تعلیم میں جدت کی مثال دیکھیں:

> "تجویز کیا جاتا ہے کہ ڈبلیو ڈبلیو ڈبلیو ڈاٹ ہکڈ آن فونیکس ڈاٹ کام پر جا کر سوچے سمجھے بغیر لفظوں کو پہچاننے کی صلاحیتیں بڑھانے کی ایوارڈ یافتہ مشقیں ڈاؤن لوڈ کی جائیں تو بہتری کا امکان ہے۔۔ ری سٹارٹ۔۔ سٹینڈ بائے۔۔ شٹ ڈاؤن۔۔"(25)

جہاں تک تعلیم میں جدت کا تعلق ہے تو اسے ایک مثبت تبدیلی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ثقافتی مغائرت کے اثرات اس اعتبار سے قابل تحسین نہیں کہ اس طرح ایک مقامی ثقافت نہ تو اپنی بنیادوں کی پیروی کے قابل رہتی ہے اور نہ ہی اس کی اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ نئی ثقافت کو من وعن اپنے اندر جگہ دے سکے۔ ایسے میں وہی معاملہ آن ٹھہرتا ہے کہ کوا میاں ہنس کی چال چلتے ہوئے اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ مغربی ثقافت نے ایسا ہی کچھ حال ہماری ثقافت کا بھی کر ڈالا ہے۔ عرفان عرفی کے ہاں مغربی ثقافت کی یلغار "چھت" کے زیرِ عنوان تحریر کے اس اقتباس میں ملاحظہ ہو:

> "رات گئے مارکیٹوں کے جلتے بجھتے کونے پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو چکے تھے۔ جو کبھی توے پر برگر فرائی کرتے تھے اب پلازے میں فوڈ کی ٹیک اوے ونڈو کھولے بیٹھے تھے اور فاسٹ فوڈ چلا رہے تھے۔۔۔ جو سامنے پزا ہاؤس کی میڈم ہے جی۔۔۔ سر جی اس پزا ہاؤس میں بہت گورا آتا ہے۔ سنا ہے جی وہ گورا لوگ بہت ٹپ دیتے ہیں جسے ہم گورا ٹِپ کہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی کرنسی میں بھی بخشیش دے دیتے ہیں۔"(26)

برگر کلچر ثقافتی مغائرت کا خصوصی تحفہ ہے جو برصغیر کے حصے میں آیا ہے۔ عالمگیری اثرات کے تحت کھانے پینے کے آداب میں بھی بڑا تغیر رونما ہو چکا ہے۔ گھر سے باہر کھانا کھانا جو کبھی ایک بہت نامناسب فعل سمجھا جاتا تھا، اب ایک تفریحی صنعت بن چکا ہے اور بہت سے شہروں میں کثیر تعداد میں فیملی ریسٹورنٹ کھل چکے ہیں۔ اندازِ طعام کی تبدیلی تو پھر اتنی ناگوار نہیں لیکن انگریزی کلچر نے ہماری ثقافت کی تمام اقدار کو مسخ کر دیا ہے۔ جنسی آسودگی کے لیے مغربی معاشرت میں مخصوص کھلونوں کا استعمال اب ہماری مقامی زندگیوں میں بھی جگہ پانے لگا ہے۔ عرفان عرفی کے ہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔ جو سٹفڈ ٹیڈی بیئر میرے ساتھ بستر میں جانے کو تیار تھا اسے ٹٹولنے کا سنسنی خیز خیال مجھے زیادہ ہانٹ کر رہا تھا۔"(27)

اب اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہو گی کہ حیا کے دین کے نام پر بننے والی ریاست کے افراد نفس کے ہاتھوں بے بس ہو چلے ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان نسل میں لو افیئر کا رجحان عام ہو رہا ہے جس کا منفی پہلو یہ ہے کہ جذبات کی رو میں بہک کر لڑکا اور لڑکی اپنی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں جس کا نتیجہ دونوں ہی کے لئے پشیمانی کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

سوااور کچھ نہیں نکلتا۔دونوں ہی اپنی عفت و عصمت کے اس گوہر نایاب سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس کی حفاظت ان کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ لیکن عالمگیریت نے شخصی آزادی کا اس قدر پرچار کیا ہے کہ اب یہ باتیں معمول لگنے لگی ہیں۔ عرفی کے ہاں جنس کے موضوع کو باریک بینی سے افسانے میں بنا گیا ہے۔ بلاشبہ عرفی نے نہایت فنکاری سے انتہائی نازک مسائل و موضوعات کو جس طرح قاری کے حوالے کیا ہے وہ دیگر مصنفین کے معمول میں نہیں۔

ثقافتی مغائرت کے افسانوی اظہار میں ایک اہم نام عاصم بٹ کا بھی ہے۔افسانوی مجموعوں "اشتہار آدمی" اور "دستک" کے علاوہ ان کا ایک ناول "دائرہ" شائع ہو چکا ہے ان کے افسانوں میں ثقافتی ادغام اور عالمگیری مسائل کی تصویر کشی عام ملتی ہے۔افسانہ "عمر گزشتہ کی کہانی" کے ایک اقتباس سے عاصم بٹ کے ہاں عالمگیری مناظرے کی مثال پیش ہے:

> "اس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی سے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ایک کتابی چہرے والی جواں سال نیوز کاسٹر دہشت گردی کی ایک عالمی واردات کے بارے میں تفصیلات بتا رہی تھی جن کے مطابق مسافروں سے بھرے دو ہوائی جہاز یکے بعد دیگرے کسی عمارت سے ٹکرا گئے تھے۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے تھے۔ کہیں نہ کہیں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔خواہ مخواہ کا شور شرابہ۔اس نے بے زاری سے سوچا۔سکرین پر تصویری رپورٹ چلنے لگی تھی جو اسے لگا وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ جلی ہوئی عمارتیں،اعضاء بریدہ لاشیں، فائر بریگیڈ کا عملہ اور خوفزدہ تماشائی۔گاہ گاہ نیوز کاسٹر لڑکی سکرین پر جلوہ افروز ہوتی۔اس نے عدم توجہی سے لڑکی کے جامنی رنگ کی لپ اسٹک میں لتھڑے ہونٹوں کو دیکھا۔اس کے چہرے پر ننھے منے مہاسے تھے جنہیں پاؤڈر کی تہہ تلے چھپایا گیا تھا۔"
> (28)

یعنی جنگ اس قدر عام ہو چلی ہے، تباہی اتنی معمول ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ میڈیا اپنی معلوماتی اوقات کھو چکا ہے۔۔ٹی وی کی سکرین پر رنگوں کا بیان چھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے خبر اور معلومات کے عناصر پس پشت چلے گئے ہیں۔میڈیا کی اس قدر چکا چوند عالمگیریت کا نتیجہ ہے جس کی بدولت ہر شے میں گلیمر در آیا ہے اور اس گلیمر کی وجہ سے اصل حقائق اور خاصے کی باتیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔عورت کی رنگین بیانی عام ہو چکی ہے۔اغیار کی ثقافت نے ہماری مقامی ثقافت میں موجود عورت کو مستور نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک عام دیکھنے کی چیز بنا ڈالا ہے۔اس ضمن میں افسانہ "اشتہار آدمی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بم سوادے"۔ملک صاحب چائے کی چسکی لیتے ہوئے ترنگ میں کہتے۔لیکن روئے سخن ہر گز چائے کی طرف نہ ہوتا۔مقصود اس خوش شکل ماڈل کا ذکر ہوتا جو چائے کے ٹی وی کمرشل اور دیگر اشتہارات میں جلوہ گر ہوتی اور غالباً یہی ان دونوں کے بیچ تعلق داری کی بنیادی وجہ تھی۔"(29)

مذکورہ بالا افسانے میں عورتوں کی خوبصورتی کا راز ایک صابن کے اشتہار میں بتایا جاتا ہے اور اسے وہی فلمی ہیروئن استعمال کرتی دکھائی دیتی ہے جو پہلے سے ہی حسین ہے۔گویا عورت ہی مرکز ہے اور ہر مشتہر شے عورت کے وجود کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔مذکورہ بالا افسانے سے اسی قبیل کی ایک اور مثال پیش ہے:

> "ایک شمارے میں روبی کا تفصیلی انٹرویو شائع ہوا۔سرورق پر اس کی رنگین تصویر موجود تھی جس میں وہ تنگ گھیرے والی بغیر بازو کے قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی اور ایک منقش کرسی پر شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بھرے بھرے برہنہ بازو اس نے اپنی چھاتیوں تلے باندھ رکھے تھے۔بازوؤں کے حلقے میں چھاتیاں خوب ابھر آئی تھیں۔ اندرونی صفحات میں بھی کچھ تصاویر تھیں۔سوئمنگ کاسٹیوم والی تصویر تو ان میں سب سے بڑھیا تھی۔۔"(30)

درج بالا حوالے سے مقامی معاشرت پر اغیار کی معاشرت کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔شاید یہ پسماندہ ممالک کی کم مائیگی ہے کہ وہ اغیار سے ترقی کے راز حاصل کرنے کی بجائے اپنی توانائی لغو کاموں میں صرف کرنے میں مصروف ہیں۔عورت معاشرے کا ایک معزز رکن ہونے کی بجائے سامانِ تسکین اور دل بہلانے کا ایک آلہ بنتی جا رہی ہے۔ دراصل پسماندہ ممالک میں کم مائیگی کے احساس نے خود استحصالی کی ایک ایسی صورتحال پیدا کر دی ہے جسکی لپیٹ میں راہنما بھی ہیں اور عوام بھی۔یہی وجہ ہے کہ ہم انفرادی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی شدید احساسِ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔پھر عاصم بٹ کے ہاں جنگ کے نتیجے میں ظہور پانے والی عصمت فروشی کا منظر ملاحظہ ہو:

"ذرا غور سے دیکھا جائے تو آپ کو ادھر ادھر نکڑوں اور فٹ پاتھوں پر عصمت فروش عورتیں ور مرد چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔۔۔ پچھلے سالوں جنگیں زیادہ ہونے کی وجہ سے مرد تعداد میں کم ہوئے ہیں۔ عورتوں کی بڑی تعداد انہی برسوں میں اس پیشے میں داخل ہوئی۔ عصمت فروش مردوں میں زیادہ تعداد بیس سے تیس برس کے لونڈوں کی ہے جو نازک اندام اور عموماً خوب بھرے ہوئے جسم کے ہوتے ہیں۔ غربت زیادہ ہے نااس لیے۔ یہ مرد وزن بعض اوقات ویڈیو کی ایک کیسٹ یا کسی معمولی ریستوران میں ایک وقت کھانے کے عوض ساتھ چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔"(31)

عالمی

تناظر میں دیکھیں تو دورِ حاضر میں عصمت فروشی ایک باقاعدہ صنعت کا درجہ رکھتی ہے اور کچھ ممالک میں اسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے۔ عورتوں کی جسم فروشی امیر زادوں کی لذت پوری کرنے کے لئے کی جاتی ہے اور اس کی قیمت وصولی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بظاہر عصمت فروشی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اسے تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ اب یہ دھندا عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں میں بھی عام ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف منافع بخش کاروبار ہونا ہی ہے۔ چونکہ سرمایہ داری منافع خوری کا نام ہے چنانچہ ایسا کاروبار جو منافع بخش ہو، اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہمارا معاشرہ بھی اس عالمگیری صنعت کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ عام طور پر افسانہ نگار مردوں میں اس کارِ بد کی نشاندہی نہیں کرتے لیکن عاصم بٹ نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بلا تفریقِ مرد و زن معاشرے کی نقد کا فریضہ سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ثقافت اور ادب کے رشتے کے حوالے سے فرخ ندیم ایک اہم نام ہیں۔ ان کا نمایاں میدان تنقید ہے تاہم اردو افسانے کے حوالے سے بھی وہ خاص پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی کتب "فکشن، کلامیہ اور ثقافتی مکانیت"، "منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ: متن اور تعبیر"، "سیمیات اور شعریات" منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اول الذکر کتاب میں فکشن و کلامیہ اور ثقافتی مکانیت کے ساتھ ساتھ ثقافت میں اقتصادی پہلو پر بھی بحث کی گئی ہے جس سے فرخ ندیم کی عالمگیری معاملات پر ناقدانہ نگاہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرخ ندیم کے افسانوں میں مابعد نوآبادیات صورتِ حال کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانے عالمگیریت اور ثقافتی مغائرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انخلا کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ "(بے) پناہ" خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں بظاہر ایک کنواری لڑکی کی ایک غنڈہ نما مرد کے ہاتھوں عصمت دری کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کہانی کے پس منظر میں عالمی مقامات و مناظرات ثقافتی انضمام کا ہی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کا موبائل فون پر معاشقہ استوار کرنا اور اپنے نام نہاد عاشق پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اپنے خاندان کی پروا کیے بغیر اس کے پاس چلے جانا مقامی اور غیر مقامی ثقافت کے ادغام کا اظہار ہے۔ یہاں محبت کے نام پر یقین کو مقامی جذباتیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن موبائل فون کے ذریعے ان دیکھا عشق اس بات کا مظہر ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک موبائل استعمال کرنے کے آداب نہیں سیکھے جا سکے۔ دوسرا یہ کہ اغیار کی ثقافت میں نامحرم لڑکے اور لڑکی کی موبائل پر محبت اور خالی فلیٹ میں میل ملاقات عام ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ چلن ثقافتی یلغار کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ افسانے کی لڑکی نے ایک ان دیکھے انجان شخص کو ایک نظر بھی نہیں دیکھ رکھا ہوتا اور اس کے لیے گھر چھوڑ کر چل پڑتی ہے۔ اس کا یہ فعل محبت کے عمل میں ڈیجیٹل معمولات کا عکاس ہے کہ جہاں ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔ وہ آمنے سامنے پہلی نظر اپنے ڈیجیٹل عاشق کو دیکھتی ہے تو بے اختیار کہتی ہے:

"آپ۔۔۔؟۔۔۔اور یہ مونچھیں اتنی بڑی کیسے ہو گئیں؟ لگتا ہے فیس بک والی تصویر کافی پرانی ہے۔ اور وہ لمبے بال کہاں گئے؟"(32)

اس حوالے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اب محبت کا معیار کیا رہ گیا ہے یا یہ کہ محبت کے محرکات کیا ہو گئے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں جو فلیٹ کلچر دکھایا گیا ہے وہ بھی ہمیں عالمگیریت کے نتیجے میں تحفے کے طور پر ملا ہے۔ اب مردوں کا کم قیمت فلیٹوں میں بغیر خاندان کے اکیلے رہنا عام ہو گیا ہے اور ایسے میں انہیں ہر فعل کی مکمل آزادی ہے کہ وہ فلیٹ کے احاطے میں جو چاہے کریں۔ بعض صورتوں میں خواتین بھی اس کلچر کو فروغ دینے میں حصہ لے رہی ہیں۔ فرخ ندیم کے خود افسانوی متن کی قرات میں مابعد نوآبادیات کے اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور یہی چیز ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک میں جس طرح دین اور حکومت کو برسرِ پیکار دیکھا اور دکھایا جاتا ہے اس کے پیچھے بھی ترقی یافتہ ممالک کی سازشیں عامل ہیں۔ افسانہ "(بے) پناہ" میں فرخ ندیم نے اس جانب بخوبی اشارہ کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی مرد کردار اپنے فعل قبیح کی بنا پر عورت کی آواز کو بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے میں عورت کا اپنے جنسی استحصال پر آواز بلند کرنا بھی مغربی چلن کی عکاسی ہے کیونکہ اس سے قبل مشرق کی عورتیں چپ چاپ اپنی عزتیں لٹا کر خود کو کپڑوں میں لپیٹ لیتی تھیں۔ لیکن فرخ ندیم کے افسانے کی عورت جب روح سے برہنہ ہوتی ہے تو اسے جسم کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

برہنگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے ننگے جسم کو اپنی سزا بنا کر اپنا استحصال کرنے والے مرد کے خلاف سڑک پہ کھڑے ہو کر آواز بلند کرتی ہے۔ مذکور مرد کو پولیس گھیر لیتی ہے تو وہ جیسے تیسے اپنے پستول سے تین پولیس اہلکاروں کو قتل کر کے پولیس کے چنگل سے وقتی طور پر نکل جاتا ہے لیکن کچھ تو فضا اس حادثے سے پہلے ہی مکدر ہوتی ہے اور کچھ قتال کا واقعہ مستزاد ثابت ہوتا ہے۔ دفعتاً آنسو گیس کا پھیلاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر مذکور مرد کا شاطرانہ فعل ملاحظہ ہو:

> "جب پولیس والے درختوں کے پیچھے رکتے شیلنگ کرنے لگے، کچھ فاصلے پر، زمین سے اٹھتے ہوئے دھویں کے پاس اسے سفید رنگ کی ایک کچلی ہوئی ٹوپی ملی۔ اپنے قدموں پر جھکتے ہوئے جلدی سے اس نے اٹھائی، سر پر رکھی۔۔ اور اچھل اچھل کر کفر کے خلاف نعرے لگاتا پولیس پر پتھراؤ کرنے لگا۔"(33)

یعنی اس معاشرے میں مذہب کے نام پر ہر شخص یہ لائسنس اپنے نام کروا سکتا ہے کہ وہ سفید ٹوپی پہن کر قانون کی مخالفت شروع کر دے۔ دراصل عالمگیری مناظرے میں مذہب کے ادارے کو از حد نقصان پہنچایا گیا ہے اور پسماندہ ممالک میں مذہب کو دہشت گردی و معاشرتی افراتفری کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ درج بالا حوالے سے اس صورت حال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح ایک بیمار ذہنیت کا شخص وقت پڑنے پر مذہب کو اپنی ڈھال بنا لیتا ہے۔ اس طرح کے افعال اچانک سرزد نہیں ہوا کرتے بلکہ معاشرے میں لاشعوری طور پر ان کی تربیت ادب اور میڈیا کی مدد سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یہی صورت حال زیادہ شدت کے ساتھ فرخ ندیم کے افسانے "پیرس شہر کا ہپی پرنس" میں ملتی ہے۔ ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

> "گھٹنوں تک لمبے کوٹ کے نیچے ایک اور جیکٹ اور وہ بھی سات کلو بارودی۔ شاباش، بھولنا نہیں ہے۔ مومن کی زندگی جہاد اور قتال کے درمیان یوں آباد ہے جیسے آسمان اور زمین کے درمیان یہ کائنات۔"(34)

مومن کی درج بالا تعبیر و تشریح بھی عالمگیریت کی دین ہے جس کے تحت مذہب اسلام کی تعبیرات و توضیحات کرنے والے اکابرین کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کے منہ میں ترقی یافتہ ممالک کی زبان ہوتی ہے جن کی منشا پر پسماندہ ممالک کو آپس میں ہی لڑوا کر تباہی کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ فرخ ندیم کے افسانوں میں ترقی یافتہ ممالک کی یہ سفاکی و عیاری کہانی کے پس پردہ دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے علامتوں کے پردے میں اپنے معاشرے میں برپا نوآبادیاتی نظام اور عالمگیریت سے ہونے والی تباہ کاریوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اپنے جاندار اسلوب سے اپنے قارئین کو ایک ایک کر کے ان پردوں سے پرے جھانک کر مسائل کا ادراک حاصل کرنے کا شعور بخشا ہے۔

دراصل آج کی ثقافت عالمگیر ثقافت ہے۔ ہمارے عقائد خواہ کچھ بھی ہوں، ہمارا رہن سہن، ہمارا لباس، حتیٰ کہ ہمارے کھانے تک عالمی ثقافت کا حصہ بن چکے ہیں۔ آج جو لباس ہم پہنتے ہیں وہی لباس امریکہ، کینیڈا، انگلستان، آسٹریلیا، برازیل، جاپان اور چین میں بھی پہنا جاتا ہے۔ ہمارے گھروں میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں، وہی ان تمام ملکوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ہمارے مختلف علاقوں کی قدیم دست کاریاں اب صرف نمائش کے لئے ہی رہ گئی ہیں۔ پیداواری آلات ہماری فکر پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب ہم عالمی سطح پر سوچتے ہیں اور اسی انداز میں زندگی گزارتے ہیں۔ عالمگیریت کے خلاف جو رد عمل پیدا ہوا ہے اس میں بھی عالمی فکر ہی کار فرما ہے۔ جب ہم اس عالمی فکر کے خلاف اپنی شناخت پر بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں تو اس سے تنگ نظری اور تشدد پیدا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اس موضوع پر بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری قدیم تہذیب نہایت ہی طاقت ور تہذیب تھی بلکہ اب تو یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ جس دراوڑ تہذیب کو ہم بہت ہی پس ماندہ تہذیب سمجھتے تھے وہ بھی خاصی ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ اس زمانے کے لوگ عراق تک تجارت کرتے تھے۔ لیکن یہ ساری باتیں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ آج ہم عالمگیری تہذیب کا حصہ ہیں اور یہ تہذیب جہاں ہمیں دوسری دنیا تک رسائی دے رہی ہے، وہیں ہماری قدیم علاقائی ثقافتیں بھی اپنی شکل بدل رہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ثقافت کی اس یلغار میں ہم اپنی ثقافت کی پہچان اور وقار برقرار رکھیں اور غیر ثقافت سے صرف اسی قدر مستعار لیں جو ہمیں نافع ہو تا کہ ہماری تہذیب و ثقافت عالمی ثقافتی یلغار کے نتیجے میں کمزور پڑنے کی بجائے مضبوط ہو سکے۔۔

حوالہ جات

1۔ عبدالحمید، پروفیسر، جدید عمرانیات، خالد پلازہ، اردو بازار، لاہور۔ ۲۰۱۹ء، ص:۱۸۱

2۔ عبدالحمید، جدید عمرانیات، محولہ بالا، ص:۱۸۸

3۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے،اکادمی بازیافت، کراچی،۲۰۰۴ء،ص:۲۵-۲۶
4۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۲۶
5۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۳۶
6۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۵۱
7۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۵۸
8۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۶۶
9۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۷۶
10۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۸۹
11۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۱۳۸
12۔ مبین مرزا،خوف کے آسمان تلے، محولہ بالا،ص:۱۷۰
13۔ مبین مرزا،زمینیں اور زمانے،اکادمی بازیافت، کراچی،۲۰۱۵ء،ا،ص:۱۰
14۔ مبین مرزا،زمینیں اور زمانے، محولہ بالا،ص:۳۳
15۔ مبین مرزا،زمینیں اور زمانے، محولہ بالا،ص ۳۴
16۔ حامد سراج،بخیہ گری،الفتح پبلی کیشنز،راولپنڈی،۲۰۱۳ء،ص ۴۲-۴۳
17۔ حامد سراج،بخیہ گری، محولہ بالا،ص ۴۳
18۔ حامد سراج،بخیہ گری، محولہ بالا،ص ۵۴
19۔ حامد سراج،بخیہ گری، محولہ بالا،ص:۵۹
20۔ حامد سراج،بخیہ گری، محولہ بالا،ص ۱۳۴
21۔ حامد سراج،برائے فروخت،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،۲۰۰۹ء،طبع دوم،ص:۵۹
22۔ حامد سراج،بخیہ گری، محولہ بالا،ص ۶۱
23۔ عرفان احمد عرفی،پاؤں،دستاویز مطبوعات،لاہور،اشاعت دوم،۲۰۱۸ء،ص:۱۵
24۔ عرفان احمد عرفی،پاؤں، محولہ بالا،۳۷
25۔ عرفان احمد عرفی،کنٹرول روم،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۷ء،ص:۵۳
26۔ عرفان احمد عرفی،پاؤں، محولہ بالا،۴۹-۵۱
27۔ عرفان احمد عرفی،پاؤں، محولہ بالا،۷۳
28۔ عاصم بٹ،دستک،۲۰۰۹ء،ص:۶۰
29۔ عاصم بٹ،دستک، محولہ بالا،ص ۵۶
30۔ عاصم بٹ،دستک، محولہ بالا،ص:۷۰
31۔ عاصم بٹ،دستک، محولہ بالا،ص:۸۵
32۔www.aikrozan.com/shelterless-urdu-short-story/
33۔www.aikrozan.com/shelterless-urdu-short-story/
34۔www.aikrozan.com